Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درجے کے زمین داروں کی تھی۔ کئی پشتوں تک ان کے خاندان میں واحد اولادِ نرینہ چلی آئی تھی، چنانچہ ان کی ملکیت کافی حد تک سالم رہی تھی۔ مگر یہ سلسلہ میاں محمد کے باپ تک پہنچ کر ختم ہو گیا تھا۔ میاں محمد کے باپ کا نام میاں احمد تھا۔ میاں احمد کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں اسے کچھ اراضی فروخت کرنا پڑی۔ بقیہ زمین چاروں بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ میاں محمد سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے تین بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں اور سب کے دو دو تین تین بیٹے ہوئے۔ بڑے ہو کر یہ سب لڑکے زمین داری میں جُت گئے۔ اپنی زمین ان کے لیے ناکافی ثابت ہوئی تو انہوں نے دوسروں کی زمین ٹھیکے پر لینی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ ان کی کاشت وسیع ہوتی چلی گئی۔ پھر چند سال کے بعد انہوں نے دوسرے کاموں میں ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک بھائی کے بیٹوں نے آٹے کی چکی اور دوسروں نے تیل نکالنے کی مشین لگا لی۔ تیسرے بھائی کے بیٹوں نے وسیع پیمانے پہ سبزیوں کی کاشت شروع کر دی۔ پھر انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹریکٹر خرید لیا اور اپنی کاشت کے علاوہ اسے کرائے پہ چلانے لگے۔ اس طرح ہوتے ہوتے تینوں بڑے بھائیوں کے گھرانے خوش حال ہو گئے۔ میاں محمد کا ایک ہی بیٹا تھا، اور وہ بھی پڑھاکو نکلا۔ میاں محمد نے بہت کوشش کی کہ اس کا بیٹا گاؤں کے مڈل سکول سے نکلنے کے بعد اس کے ساتھ کاشت کاری میں لگ جائے، مگر ظفر نے شہر جا کر پڑھنے کی ضد کی۔ پھر جب اس نے میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا تو میاں محمد نے زمین داری کی جانب سے امید اتار کر تمام تر اپنے بیٹے کی تعلیم پہ باندھ دی جب ظفر نے بی اے پاس کیا اور فوڈ انسپکٹر ہو گیا تو میاں محمد کو پہلی خوشی نصیب ہوئی۔ ظفر کے تایا زاد بھائی بھی اس کو اب اپنے ساتھ برابری کا رتبہ دینے لگے۔ ظفر اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے اتنی تعلیم پائی اور سرکاری نوکری کی تھی۔ مگر جب ظفر مجسٹریٹ ہو گیا تو یکایک گویا میاں محمد کی دنیا کا رنگ ہی بدل گیا۔ اپنے خاندان، بلکہ برادری بھر میں وہ سب سے نچلی حیثیت سے اٹھ کر سب سے اوپر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ گیا۔ دیہات کے علاقوں میں صرف دو سرکاری شعبوں کی وقعت ہوتی ہے: محکمہ مال، یا پھر نظم و ضبط سے تعلق رکھنے والے محکمے۔ اس گاؤں سے دو اور آدمی ایسے نکلے تھے جو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے تھے۔ مگر وہ ریلوے اور کسٹم کے محکموں میں تھے، چنانچہ ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ گاؤں میں ان کے پکے مکان تھے۔ (اس قتل کے بعد میاں محمد نے ان دونوں تک رسائی حاصل کر کے پولیس کے پاس ان کی سفارش کروائی تھی، مگر کام نہ بنا تھا) اس کے برعکس کسی کا مجسٹریٹ بن جانا، اور لوگوں کو "باندھنے" کا اختیار حاصل کر لینا گویا "حکومت" میں شامل ہو جانا تھا۔ "چوہدری جی تو اب سرکار ہو گئے ہیں، میاں جی،" مبارک باد دینے والے کہتے تھے، "جس کو مرضی ہو چھوڑ دیں، جس کو مرضی ہو باندھ دیں۔" میاں محمد کے بڑے بھائی، جو آج تک اس کو اپنے سے کم حیثیت کا جان کر اسے گھاس نہیں ڈالتے تھے، اب ہر روز شام کو اس کے گھر پہ بیٹھے ہوتے تھے۔ ظفر کے تایا زاد بھائی، جو عمر میں اس سے بڑے تھے، اب اسے اپنے سے بڑے کا رتبہ دینے لگے تھے۔ خاندان کا ایک ایک فرد اب اس پہ بجا طور پہ فخر کرتا تھا۔ میاں محمد کا رتبہ گاؤں میں اب پٹواری، ذیلدار، ضلع دار وغیرہ سب سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے ظفر کی بہن کی شادی نمبردار کے بیٹے سے کی جو ان کی برادری کا ہی آدمی تھا۔ اس کا داماد الیف اے تک پڑھا ہوا تھا اور زمین داری کے علاوہ گاؤں کے سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس علاقے میں دور دور تک کے دیہات میں ظفر واحد شخص تھا جو مجسٹریٹ ہوا تھا۔ بڑے سے بڑا زمین دار اسے اپنی بیٹی دینے پہ آمادہ تھا۔ مگر میاں محمد کی نظر اپنے ایک بھائی کی بیٹی پہ تھی۔ جب ظفر نے ناواقف لوگوں میں شادی کر لی تو یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے گھر والوں کو کسی قسم کا صدمہ پہنچایا۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ ظفر کی بیوی ایک مہاجر کنبے سے تعلق رکھتی ہے تو ظفر کے خاندان والوں کو ایسا لگا جیسے ان کی بے عزتی ہو گئی ہے۔ مگر ظفر کی حیثیت اب ایسی تھی کہ کوئی اس کے سامنے آواز نہ اٹھا سکتا تھا۔ جب موقعہ آیا تو ان سب باتوں کو نظر انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے میاں محمد نے بڑے کرّ و فر سے اپنے بیٹے کی شادی کی۔ ظفر کی بیوی کوثر ان کے گاؤں میں بیاہ کر آئی۔ تین روز گاؤں میں رہنے کے بعد دونوں میاں بیوی قصور چلے گئے۔ کوثر کی چند سالہ بیاہتا زندگی میں صرف وہ تین دن ایسے تھے جو اس نے اپنے سسرال کے گاؤں میں گزارے تھے۔ اس وقت تک میاں محمد نے اپنے گھر کے ساتھ دو پکے کمرے نہ بنوائے تھے، چنانچہ اس نے اپنے بیٹے اور بہو کو تین روز تک اپنے بڑے بھائی کے پکے گھر میں رکھا۔ یہ ساری تفصیلات اسی رات کو میاں محمد نے مجھے بتائیں۔ میں بستر پہ ٹانگیں سمیٹے لحاف اوڑھ کر بیٹھا تھا۔ وہ رات سخت سرد تھی۔ باہر کھیتوں پہ کہرا گر رہا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سال آلوؤں کی فصل تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ میاں محمد دوسری چارپائی پہ کمبل لپیٹے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ایک مٹھی حقے کی نالی کے گرد لپٹی تھی، مگر حقہ بجھ چکا تھا۔ اس شخص نے چند سال کے عرصے میں زمین سے آسمان تک کا سفر کیا تھا اور پھر زمین پہ آ گرا تھا۔ اب وہ ایک ایک بات کی تفصیل اس طرح مجھے بتائے جا رہا تھا جیسے اس کے بیٹے کی رہائی میرے ہاتھ میں تھی، اور اس کا تمام تر انحصار ان باتوں پہ تھا جو وہ مجھ کو بتا رہا تھا۔ میں نے دیر ہوئی اس سے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ اس کا داماد کچھ دیر کے لیے ہمارے پاس آ کر بیٹھا رہا تھا۔ پھر گھر کے اندر سے ایک جوان عورت کے رونے کی آواز آنے لگی تو وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عورت کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔ میاں محمد نے پلک تک نہ جھپکی، اسی طرح باتیں کرتا رہا۔ اس کی بینائی ضائع ہوتی جا رہی تھی اور وہ تنہا رہ گیا تھا۔ جس دن سے میں اس قصے میں پڑا تھا آج پہلی بار میں نے اس بے یار و مددگار بڈھے کے سامنے بیٹھے بیٹھے اپنے کیے پر ندامت محسوس کی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

میں صرف ایک دن اور رات مزید وہاں پہ ٹھہرا۔ اس گاؤں میں میں نے اور کسی سے بات نہ کی۔ اگلا دن سارا میں نے شہر میں بسر کیا۔ ظفر کے بارے میں کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات سامنے نہ آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی میں پڑھائی، اور پڑھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں محنت کے سوا اور کچھ نہ رکھا تھا، اسی طرح جیسے بعد میں ملازمت کے دوران اپنے کام کے علاوہ اسے کسی اور شے کے ساتھ دلچسپی نہ رہی تھی۔ شہر میں میں اس کے پرانے ہائی سکول میں گیا، ماسٹروں سے بات چیت کی، پھر کالج کا رخ کیا۔ اس کے پرانے استاد وہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک دو ہم جماعت اسی کالج میں لیکچرار آ لگے تھے۔ ان کے ساتھ تفصیل سے بات ہوئی۔ کالج کے استادوں کو اس واقعے کا علم تھا۔ ان سب نے گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ ظفر ان کو اچھی طرح سے یاد تھا۔ وہ کالج کا ایک ہونہار طالب علم رہ چکا تھا۔ میں سارے کالج میں گھومتا رہا، جیسے ظفر کی شخصیت کی کوئی رمق تلاش کر رہا ہوں۔ کوئی تصویر، کوئی سند، کوئی ٹرافی، کوئی نام۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ چند استادوں کی یادوں کے علاوہ اس نے کہیں پر اپنا نشان نہ چھوڑا تھا۔ بڑے ہال میں، کامن روم میں، لائبریری میں، جہاں پرانے کھلاڑیوں کی، اتھلیٹوں کی، مباحثوں میں حصہ لینے والوں کی تصویریں آویزاں تھیں، ظفر کا کہیں نام نہ تھا۔ کالج کی عمارت کے اندر پھرتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ظفر کی جگہ پر میں ہوتا تو میرا نام و نشان ڈھونڈنے والا بھی شاید اسی طرح خالی ہاتھ لوٹتا۔ وقت ایسی صفائی کے ساتھ زندگیوں کے نشان مٹاتا جاتا ہے۔ میں کالج سے واپس لوٹ رہا تھا تو اچانک مجھے ایاز کی ایک بات یاد آئی۔ یہ خیال گویا اندھیرے میں ایک روشنی کی کرن کے مطابق تھا۔ اس نے کہا تھا، "یا پھر کوئی کہانی لکھو!" کیوں نہ میں کچھ لکھنا ہی شروع کر دوں، میں نے سوچا؟ ہو سکتا ہے کوئی نکتہ ہاتھ آ جائے، یا کوئی راستہ نکلے۔ ایک جگہ پر تانگہ ٹھہرا کر میں نے ایک موٹی سی کاپی خریدی۔ اس رات کو میں ظفر کے باپ کے گھر پر لالٹین کی روشنی میں اپنے سامنے کاپی کھولے بیٹھا رہا، مگر ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔ اگلی صبح کو میں وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر لوٹ آیا۔ دن بھر میں اسی سوچ میں رہا کہ کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں، کدھر کو جاؤں؟ آج تک تو میں اپنے خیال کو دور و نزدیک دوڑا کر حالات کو اور واقعات کو وضع کرتا اور انہیں اپنے الفاظ میں ڈھالتا رہا تھا۔ یہ آسان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام تھا۔ کوئی حال دشوار پڑا تو اسے بدل دیا، کوئی لفظ ٹھیک نہ بیٹھا تو کاٹ دیا۔ یہ باتیں میرے اختیار کی تھیں۔ اب جب کہ ایک اصل صورتِ حال سے میرا سامنا ہوا تھا تو مجھے پتا چل رہا تھا کہ کسی حقیقی واقعے کے بارے میں لکھنا کس قدر مشکل کام تھا۔ میرے الفاظ جواب دے گئے تھے۔ میری تحریر کی بناوٹ تک ناکارہ ہو چکی تھی۔ پہلی بار پورے طور پر مجھے اس بات کا شعور ہوا کہ دنیا کے اصل واقعات میرے قابو سے باہر تھے۔ ان سے نبٹنے کے لیے پرانے حربے ناکارہ ہو چکے تھے۔ اب کسی نئے حربے کی ضرورت تھی۔ وہ حربہ کیا تھا؟ میرا ذہن اس معاملے میں کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ رات کو جب میں کاپی کھول کر بیٹھا تو اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ میں کیا لکھنے والا ہوں۔ کچھ دیر تک میں اسی طرح بے خیالی میں بیٹھا رہا۔ پھر اچانک میں نے بے سوچے سمجھے قلم اٹھایا اور پہلے صفحے پر لکھ دیا: "میری ڈائری"۔ دیر تک میں ان دو لفظوں کو، جو میرے قلم نے بطور عنوان صفحے پہ لکھے تھے، بیٹھا دیکھتا رہا۔ مجھے نظر آنے لگا کہ یہ دو لفظ ہی تھے جو میرا صحیح راستہ تھے، گویا دن بھر کی کشمکش کے دوران، میرے جانے بوجھے بغیر، میرا احساس ایک فیصلے پہ پہنچ چکا تھا، اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں نئے سرے سے اپنی ابتدا کروں، جس طرح کہ آج بھی دنیا کے انگنت بچے اپنے اظہار کے لیے رات کو بستروں میں بیٹھ کر لکھنا شروع کرتے ہیں: میری پیاری ڈائری ــــ

میں بیس سال سے ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مگر وہ دن میری ڈائری کا پہلا دن تھا۔ آج اسکی اوّلیں جلد کا پہلا صفحہ میرے سامنے کھلا پڑا ہے، اور اسے دیکھ کر میرے دل میں عجیب و غریب جذبات امڈ آئے ہیں، جیسے کوئی اپنی جوانی کی تصویر دیکھ لے۔ جب تک میں نے اس صفحے پہ نظر نہ ڈالی تھی مجھے خیال نہ تھا کہ ان بیس برسوں میں میری لکھائی کس حد تک بدل چکی ہے۔ مجموعی طور پہ لکھائی کا انداز شاید وہی ہے، اور دیکھنے والا آج بھی غالباً آسانی سے اسے پہچان لے گا، مگر لفظوں کی بناوٹ میں، سطروں کی صفائی میں، شدّ و مد میں، الفوں کے عمود میں ایک ایسا توازن اور ایسی توانائی ہے جسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں، اور جو آج میری لکھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہیں نظر نہیں آتی۔

اس صفحے پر یہ عبارت درج ہے:

"دن کا بیشتر حصہ میں سکول اور کالج میں پھرتا رہا۔ جب وہاں سے نکلا تو کچھ تھک چکا تھا۔ واپس روانہ ہونے سے پہلے میں کچھ دیر کے لیے کالج کی عمارت سے نکل کر ہاکی کی گراؤنڈ میں جا بیٹھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا چل رہی تھی، مگر تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گراؤنڈ کے بیچ میں طالب علموں کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ وہ دھوپ میں بیٹھے سنگترے چھیل چھیل کر کھا رہے تھے اور اونچی آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ظفر نے کسی کھیل میں حصہ نہ لیا تھا۔ وہ کسی امتحان میں اوّل نہ آیا تھا۔ نہ اس نے کوئی مقابلہ جیتا تھا نہ کسی انتخاب میں نمائندگی حاصل کی تھی۔ یہ سچ تھا کہ وہ ہمیشہ چوٹی کے چند ایک طالب علموں میں شمار ہوا تھا، مگر کسی کے ماضی کی تلاش کے لیے یہ کافی نہیں ہوتا۔ اس بات کا مجھے پتا چلا تھا۔ لڑکوں کی ٹولی میں سے اب چند ایک آنکھیں بند کیے زمین پہ لیٹے ستا رہے تھے۔ باقیوں نے سگریٹ سلگا لیے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ یہ سوچ کر میرے دل میں افسوس پیدا ہوا کہ بیشتر زندگیوں کی جدوجہد ایسے علاقے میں واقع ہوتی ہے جو گم نام رہتا ہے، گویا کبھی موجود ہی نہ تھا۔

اب آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک ایسے آدمی کا نقشہ ابھرتا آ رہا ہے جس نے اپنی قوت اور صلاحیت کے مطابق اپنی زندگی بنائی تھی، جسے صرف اپنے کام سے غرض تھی، جس نے اپنا وقت ضائع نہ کیا تھا، اپنی قوت ادھر ادھر کے کاموں میں صرف نہ کی تھی، جسے علم تھا کہ وہ کبھی چوٹی تک نہ پہنچے گا مگر جانتا تھا کہ چوٹی کے آس پاس تک رسائی حاصل کر لے گا، اور اس سے مطمئن تھا۔ ایک ایسا شخص جو اب بااختیار حاکم تھا۔ جس ماحول میں اس نے نشوونما پائی تھی وہ زندگی کی سادگی کا ماحول تھا۔ وہاں گیہوں کی دو روٹیاں، ایک آدھ کپڑا اور ایک عورت زندگی کی کل ضروریات تھیں۔ ظفر نے اپنی ضرورت سے زیادہ حاصل کر لیا تھا۔ اسے کسی شے کی ہوس نہ رہی تھی۔ قدرتی امر تھا کہ اس کی بیوی نے، جو لاہور کے ایک کالج میں تعلیم پاتی رہی تھی، اپنے لیے فرار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک راستہ تلاش کر لیا تھا۔ گو یہ امر بھی یقینی تھا کہ فرار کا یہ راستہ عارضی تھا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتیں اپنے حالات سے چاہے کتنی بھی بے اطمینان کیوں نہ ہوں، ایک آرام دہ اور بااختیار زندگی کو چھوڑنے کا تصوّر نہیں کرتیں، سوا ہ ایسے موقعے کے کہ جب انہیں اپنے آگے پہلے سے زیادہ آرام دہ اور بااختیار زندگی کا امکان نظر آئے۔ ظاہر تھا کہ ظفر کا اگر دیہات سے تعلق نہ ہوتا، اگر اس میں شہری زندگی کی لچک پائی جاتی، تو وہ اپنی بیوی کو آسانی سے سیدھے راستے پر لا سکتا تھا۔ مگر ظفر ایک مختلف قسم کا آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ....."

یہاں پر عبارت ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے میں خوشی خوشی لکھتا چلا آ رہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا جیسے حقیقت میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ میں اپنی پرانی طرزِ تحریر میں داخل ہو چکا تھا۔ ظفر میرا ایک کردار بن چکا تھا، اور میں اپنے "خیال" کے زور سے اس کی شخصیت کی گتھیاں کھولتا جا رہا تھا۔ میرے خیال نے اصل روداد پہ قبضہ پا لیا تھا۔ اب یہ میرے ہاتھ میں ایک خودکار کھلونے کی مانند تھا جس کے اندر میں نے چابی بھر دی تھی اور اسے اپنے محور کے گرد چکر کاٹتے دیکھ کر خاطر خواہ طمانیت حاصل کر رہا تھا۔ آخر گھوم پھر کر میں اس مقام پہ آ پہنچا تھا جہاں یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ ظفر ایک ایسا شخص تھا جس کے لیے قتل کرنا ایک قدرتی امر بن گیا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے ہم چلے تھے۔ میرا قلم تھم گیا۔ ایک بار پھر مجھے دنیا کے ایک حقیقی مسئلے کے مقابل ادیب کے "تخیل" کی بے وسعتی کا اندازہ ہوا۔ ظفر نے قتل کیا تھا، اس بات کی تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ کس وجہ سے کیا تھا، یہ بھی معلوم تھا۔ دریافت یہ کرنا تھا کہ ان حالات کے اندر، اس واقعے کی موجودگی میں، ظفر کی بے گناہی کس طرح ثابت کی جائے؟ میں اپنی مرضی کے مطابق حالات کا رخ نہ موڑ سکتا تھا۔ میری زندگی اور میرے "ادب" کے درمیان جو فاصلہ ہمیشہ سے قائم رہا تھا، اس کی حقیقت اس مقام پہ آ کر مجھ پہ آشکار ہو گئی تھی —— ادیب کے ہاتھ میں طرح طرح کے حربے ہوتے ہیں، جنہیں وہ اصل صورتِ حال سے آنکھ چرانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے استعمال کرتا رہتا ہے۔ اس کی توجیہات کا اطلاق بدلی ہوئی شکلوں پہ ہوتا ہے، جن کی اصلیت الفاظ کے رعب و داب کے دھندلکے کے اندر دیکھی نہیں جا سکتی۔ ادب دھوکا دہی کا گھر ہے۔

کوئی شخص عمر بھر کی کاوش کو اتنی آسانی سے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میں نے بار بار اپنی تحریر کو پڑھا، گویا کوئی گورکھ دھندا ہو جس کا ایک سرا کسی لفظ کے اندر پوشیدہ ہو۔ اس کا کوئی سرا تو میرے ہاتھ نہ آیا، مگر کئی بار پڑھنے کے دوران کم از کم دو باتیں مجھ پہ ایسی کھلیں جنہوں نے اس کھوج میں میرا قدم کچھ آگے بڑھایا۔ ظفر کی شخصیت کا جو تجزیہ میں نے اپنے طور کیا تھا، غالباً ساتویں بار اس کو پڑھتے ہوئے اچانک مجھے یوں لگا جیسے ظفر کی جگہ پہ ایاز کھڑا ہو۔ پہلے میں نے سوچا کہ یہ ان آوارہ خیالوں میں سے ایک تھا جو میرے ذہن سے اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ احساس غایب ہونے کی بجائے مضبوط ہوتا گیا۔ آخر میں نے ڈائری کو ایک طرف رکھ دیا اور ایاز کے بارے میں سوچنے لگا۔ بے شک ظفر اور ایاز کے ماضی میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ ان دونوں کی زندگی جس طور سے شروع ہوئی اور جس ڈھب پہ آگے بڑھی، تقریباً ایک ہی کہانی معلوم ہوتی تھی۔ غریب خاندان، غیر تعلیمی ماحول، رکاوٹیں، دشواریاں، خداداد ذہانت، محنت کے بل پہ کامیابی، نچلے طبقے سے اونچے طبقے کا رخ، آبائی گھروں کو خیرباد، دوسرے خاندانوں میں شادیاں، بیویوں کا سسرال سے قطع تعلق وغیرہ وغیرہ۔ جیسے جیسے میں سوچتا گیا میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ تھیں! مجھے یاد آیا کہ ایک بار مجھے خیال آیا تھا کہ ایاز نے آخر کیوں اس مقدمے کو لیا اور پھر اس کو اتنی اہمیت دی تھی، جب کہ اس میں نہ بھاری فیس تھی نہ کوئی اصولی بات۔ یہ ضرور تھا کہ ہم سب کی ہمدردیاں ظفر کے ساتھ تھیں، اور میں بھی آخر اس نتیجے پہ پہنچا تھا کہ گو ظفر نے قتل کیا تھا، مگر درحقیقت وہ بے قصور تھا۔ مگر یہ میرے، جیسے ادیب کے کہنے کی بات تھی۔ ایاز جیسے قانونی دماغ رکھنے والے آدمی کے لیے یہ کہنا کہ "ظفر بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گناہ ہے، صرف ثابت کرنے کی بات ہے" ایک غیر معمولی امر تھا۔ کیا ایسی بات تو نہ تھی، میں نے سوچا، کہ ایاز نے ظفر کے اندر اپنی شکل دیکھی تھی، اور اسے بچانے پہ تلا ہوا تھا؟ کیا ظفر کو بچانے کی مہم ایاز کے لیے ایک جذباتی معاملہ بن گیا تھا؟ کیا یہ اس پورے طبقے کی مہم بن چکی تھی جس سے ان دونوں کا ماضی وابستہ تھا؟ اس حق کے تحفظ کی مہم جس حق کی رُو سے ایک غریب لڑکا اپنے طبقے سے اٹھ کر دوسرے طبقے میں قدم رکھنے کی جرأت کرتا تھا؟ اور اگر وہ ظفر کو بچا نہ سکا تو پھر؟ ان دونوں کی زندگیوں کی غیر معمولی مشابہت ایک ایسی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ ایک لحظے کے لیے میرا دل دہل گیا۔ یہ واقعی ایک بے ڈھنگا خیال ہے، میں نے سوچا۔ ایسے اتفاقات صرف ادیبوں کے ذہنوں میں راہ پاتے ہیں۔ اصل زندگیاں اپنی اپنی راہ الگ نکالتی ہیں۔ جس خیال نے اس وقت اس وسوسے کو رد کرنے میں میری مدد کی وہ اب پڑھنے والوں کو شاید مضحکہ خیز لگے، مگر اس وقت مجھے عین حقیقی معلوم ہوا۔ ایاز اور ظفر کی زندگیوں میں مشابہت ضرور تھی، مگر ایک بہت بڑی بات کا فرق بھی تھا: ایاز ہمیشہ اوّل آتا رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے ذہن میں یہ الفاظ دہرائے — ایاز ہمیشہ اوّل آتا رہا تھا۔ اپنی تعلیم میں، کام میں، پیشے میں۔ اور وہ کبھی اپنی زندگی میں اس حد تک مطمئن نہ ہوا تھا کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ اسے زندگی کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ وہ جس مقام پہ بھی پہنچے گا، اپنے لیے جد و جہد کی کوئی صورت نکال لے گا۔ اس کی زندگی گم نام نہ تھی۔ اس نے نام پیدا کیا تھا۔

دوسری بات جو اس رات کو میرے ذہن میں آئی وہ کوثر تھی۔ متعدد بار اپنی ڈائری کو پڑھ چکنے کے بعد میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا تھا کہ بہت آہستہ آہستہ، گویا میرے لاشعور کے دھندلکے سے ایک عورت کی شبیہہ اُبھرنی شروع ہوئی۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ ظفر کی بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت سے میرے سامنے آئی تھی۔ میں نے کہا ہے کہ وہ "میرے سامنے آئی تھی"۔ اور یہ الفاظ میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیے ہیں۔ کیوں کہ اس کے نمودار ہونے کا حال ایک عجیب کیفیت کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حال تھا۔ وہ میرے خیال میں پیدا ہوئی تھی، اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے گویا میری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت تھا اور ہمارے گھر میں سب سو چکے تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا، اور اس ہُو کے عالم میں میں نے اس عورت کی موجودگی کو وہاں پہ اس طرح محسوس کیا۔ جیسے کوئی جیتا جاگتا ہوا انسان درحقیقت میرے ہمراہ اس کمرے میں ہو۔ یہ کیفیت صرف ایک لمحے تک رہی پھر غائب ہوگئی۔ میں کمزور دل کا آدمی نہیں ہوں، مگر جب مجھے خیال آیا کہ یہ عورت مرچکی ہے، اور میں نے اسے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، تو میرا دل وحشت سے دھڑک اٹھا۔ میں نے بے اختیار مڑکر اپنے پیچھے نظر ڈالی، چاروں طرف دیکھا، تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر کمرے میں چلتا پھرتا رہا، پھر واپس آکر بیٹھ گیا۔ میرے واہمے نے پہلے کبھی یہ شکل اختیار نہ کی تھی۔ دیر تک میرے خیال میں اس کی شبیہہ گھومتی رہی، جیسے کہہ رہی ہو، میرے پاس آؤ، میرا تپا نکالو، میں کوثر ہوں ..... اس رات کو پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں کس قدر پُرخطر سرزمین پہ آنکلا تھا۔ اس واردات کا سراغ اگر کہیں پہ تھا تو نہ ظفر میں تھا نہ ظفر کے حالات میں تھا، بلکہ اس عورت میں تھا جو مرچکی تھی، وہ عورت جو ہلاک ہونے سے پہلے ایک جیتا جاگتا ہوا انسان تھی اور جس کا دنیا میں نام ونشان تھا، اور جو اس وقت ایک پُرطلسم، شیطانی روپ میں نمودار ہوکر ہوا میں کھڑی مجھے اشارے کر رہی تھی، ان عورتوں کی مانند جو رات کے اندھیرے میں شہر سے باہر بیابان رستوں پہ نکل جاتی ہیں اور راہ گیروں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔

دو دن کے بعد آخر میں دل میں ایک پکا ارادہ لے کر لاہور پہنچا۔

ایاز سے میں نے ڈائری کا ذکر نہ کیا، صرف مختصر طور پہ اسے بتا دیا کہ ظفر کے بارے میں مجھے کیا معلومات حاصل ہو سکی تھیں۔ جہاں تک میرا واسطہ تھا، یہ باتیں اب کم وبیش بے کار ہو چکی تھیں۔ میری تلاش اب صرف ایک بات پہ مرکوز تھی۔ تاہم، ایاز کو ظفر کے گاؤں کی روداد سنانا ضروری تھا۔ جب میں اس سے باتیں کر رہا تھا تو معمول سے زیادہ توجہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا، مگر اس کے چہرے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے کچھ بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کا رویہ سراسر پیشہ ورانہ تھا۔ آخر میں میں نے ایاز سے اپنے دل کی بات کہی۔

"کوثر کے خاندان سے ملنا مشکل کام ہے۔" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"ہمیں اس کا اختیار تو ہے، مگر پراسیکیوشن اعتراض کر سکتی ہے۔ خاص طور سے اگر ہمارے علاوہ کوئی تیسرا آدمی جا کر ان سے سوال جواب کرنے لگے تو گواہان پر دباؤ ڈالنے کا الزام لگ سکتا ہے۔"

"پھر اس کی کیا صورت ہو؟" میں نے کہا۔

"ظفر کی بیوی کے بارے میں سب معلومات ہمارے پاس موجود ہیں۔ تم نے دیکھی نہیں؟"

"دیکھی تو ہیں۔" میں نے کہا، "مگر ذہن سے نکل گئی ہیں۔"

"دفتر میں آ کر پڑھ لو۔" ایاز نے کہا۔

"مگر ایاز۔" آخر میں بولا، "میرے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی ایسے شخص سے بات کروں جو اس کا قریبی ہو۔ اس کی ماں موجود ہے۔"

"میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دیتا۔" ایاز نے جواب دیا، "اس کی ماں تو پراسیکیوشن کی طرف سے بھی پیش ہونے پہ راضی نہیں ہوئی۔ استغاثے کے گواہوں میں اس کا نام موجود نہیں ہے۔"

"مگر کیا یہ صحیح نہیں کہ گھر بھر میں کوثر کو سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی؟"

"اطلاع تو یہی ہے۔"

"پھر وہ استغاثے کی جانب سے پیش کیوں نہیں ہو رہی؟"

"یہ راز ہم پہ نہیں کھلا۔ ایک وقت میں یہ تجویز بھی ہمارے زیرِ غور آئی تھی کہ اسے گواہ کے طور پہ بلایا جائے۔ مگر اس کے بارے میں ہمیں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ بہرحال، سوال یہ ہے کہ اگر وہ استغاثے کی طرف سے پیش نہیں ہوئی تو تمہیں کہاں ملے گی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایاز کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس مقدمے کے اندر میرا مزید دخل نہ چاہتا تھا۔ اس وقت میں خاموش ہو رہا۔ مگر صورت یہ تھی کہ میرا دخل اس معاملے میں اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اب میرے لیے اسے مزید آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگلے دو دن اسی بے چینی میں گزر گئے۔ دوسرے روز میں نے اس ملازمہ سے ملنے کا ارادہ کیا جو آخری دنوں میں ظفر اور کوثر کے گھر میں کام کرتی رہی تھی۔ مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ میرے دل میں کوثر کا، اور اس کی ماں کا خیال اس قدر جم کر بیٹھ چکا تھا کہ مجھے کسی اور چیز سے دل چسپی نہ رہی تھی۔ میں نے ایاز کے دفتر کا ایک چکر لگایا اور بے دلی سے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔ ان میں سے جو کچھ کوثر کے بارے میں اخذ کر سکا وہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے :

یہ لوگ دلی کے قریب ایک قصبے کے بڑے زمیں دار تھے۔ کوثر کے والد اپنے خاندان کے واحد فرد تھے جو کالج تک پڑھے تھے، چنانچہ عرصے سے وہ زمیں دار کا کام اپنے بھائیوں کے سپرد کر کے شہر میں آ بسے تھے۔ ان کا ایک بیٹا اور سب سے چھوٹی بیٹی کوثر زندہ بچے تھے، بیچ کی متعدد اولادیں بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ دونوں بچوں کے درمیان پچیس تیس برس کا فرق تھا۔ بیٹا دلی کے ایک کالج میں پڑھنے اور چند برس بے کار گھر پہ گزارنے کے بعد دنیا کی سیاحت پہ نکل گیا تھا۔ ملک کے بٹوارے کے وقت پر ایک لمبے عرصے سے اس کی طرف سے کوئی خبر موصول نہ ہوئی تھی۔ آخری اطلاع کوئی آٹھ برس قبل ملی تھی جس کے مطابق وہ جاوا سماٹرا کے کسی جزیرے پہ قیام پذیر تھا۔ پھر جنگ کے دوران کچھ لوگ جاوا سماٹرا سے ہو کر واپس آئے تھے۔ ان میں سے ایک کا کہنا تھا کہ اس نے قیصر (کوثر کے بھائی کا نام) کو ایک چھوٹے سے جزیرے پر رہتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک مقامی عورت سے شادی کر لی تھی۔ ان کے بہت سے بچے تھے اور وہ اب مقامی لوگوں کی مانند ایک لنگوٹ باندھے گھاس پھونس کی جھونپڑی میں زندگی بسر کر رہا تھا اور بہت خوش نظر آتا تھا۔ سن چھیالیس میں کوثر کے والد نے بذاتِ خود جاوا سماٹرا جا کر اپنے بیٹے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپس لانے کے انتظامات شروع کر دیے۔ مگر ان کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ انہی دنوں میں وہ بیمار پڑ گئے اور چند ہفتے کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا۔ کوثر کی عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی۔ خاندان میں اب عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ قیصر کی واپسی کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ جب سن سینتالیس آیا تو خاندان کے اندر اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ کوثر کے چچاؤں نے اپنا گاؤں اور ملک چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ کوثر کے ماموں جو اسی علاقے کے جاگیر دار تھے، بہن اور بھانجی کو اپنے کنبے کے ہمراہ لے کر وہاں سے ہجرت کر آئے۔ ان کا پہلا پڑاؤ لاہور میں آیا۔ چند ہی روز کے بعد ان کو اپنے علاقے کے ایک مہاجر کے ذریعے اطلاع ملی کہ قصور میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی ایک بہت بڑی حویلی بند پڑی ہے جس کے اوپر ان کا دعوےٰ چل سکتا ہے۔ چنانچہ راتوں رات سارا کنبہ اٹھا اور اس حویلی پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ بعد میں ان کے کلیم کے اندر وہ حویلی ان کے نام ہو گئی۔ کوثر کے ماموں کو کچھ نہری اور بہت ساری بارانی زمین الاٹ ہو گئی۔ کوثر کی ماں کا کلیم کئی سال تک عدالتوں میں چلتا رہا، کیونکہ قانونی طور پر اس کا بیٹا اصل وارث تھا، جس کے مرنے جینے کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ (اسی کلیم کے سلسلے میں ظفر سے اس گھرانے کی ملاقات ہوئی تھی۔) آخر میں کوثر کی ماں کو بھی اپنے حصے کی کچھ زمین الاٹ ہو گئی تھی۔ پہلی سی آب و تاب تو نہ رہی تھی، مگر کوثر کے ماموں کے ہاتھ اتنی جائیداد آ گئی تھی کہ حویلی کے اندر باہر کا سلسلہ فراغت سے چل رہا تھا۔ کوثر قصور کے سکول اور بعد میں لاہور کے ایک کالج میں تعلیم پاتی رہی۔ کالج سے نکل کر اس کی شادی ہو گئی۔ اس سے بعد کے واقعات پہلے بیان میں آ چکے ہیں۔ بیچ میں صرف کالج کے زمانے کے معاشقے کا ایک معاملہ تھا، مگر تھوڑی سی غور کے بعد میں نے اسے لاحاصل جان کر ذہن سے رد کر دیا۔ جب سے میں نے ایاز کے ساتھ گفتگو کی تھی میرے دل سے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی امید نکلتی جا رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ میرا یہ شک اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ دنیا میں اگر کوئی فردِ واحد ایسا تھا جس سے مجھے، ارادی یا غیر ارادی طور پر، کوثر کے اعمال کی خبر مل سکتی تھی تو وہ کوثر کی ماں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ مگر اس سے ملنے کی کیا صورت ہو؟ میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آ رہی تھی۔

پھر تیسرے دن گویا غیب سے مدد وارد ہوئی، اور پہلے کی طرح ایاز کی جانب سے آئی۔ شام کے وقت ایاز گھر واپس آیا تو کسی سوچ میں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بولا:

"ٹہلنے چلتے ہو؟"

ہم اٹھ کر باہر نکل آئے۔ کچھ دیر تک خاموش چلتے رہنے کے بعد ایاز بولا: "کوثر کی ماں سے ملنے کی ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی کیفیت تھی، جیسے وہ اپنی مرضی کے خلاف یہ بات کر رہا ہو، مگر اس کے باوجود کرنا چاہتا ہو۔

"کیا ترکیب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں شہر میں ایک حکیم ہے۔ چھوٹی موٹی پیری مریدی بھی کرتا ہے۔ کوثر کی ماں اس کی معتقد ہے۔ پہلے وہ برابر یہاں اس سے ملنے آیا کرتی تھی۔ جب سے اس کی صحت بگڑ گئی ہے حکیم قصور کا چکر لگاتا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے حکیم مجھے اس سے ملوا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہماری اطلاع تو یہی ہے کہ کوثر کی ماں اس کی مریض بھی ہے اور مرید بھی۔"

"میں اس سے جا کر کیا کہوں؟" میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟" ایاز ہنس کر بولا، "تم اب اس کام میں مجھ سے زیادہ طاق ہوتے جا رہے ہو۔" پھر وہ یکایک ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے بولا، "مگر ایک بات کی وارننگ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اگر تم جا کر اس سے ملتے ہو تو ہمیں اس بات کی کوئی خبر نہیں۔" میں ہکا بکا ایاز کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولا، "اور اگر اس کی وجہ سے مقدمے کے خراب ہونے کا کوئی پہلو نکلتا ہے، تو پھر مدد کے لیے تم میری طرف نہیں دیکھ سکتے۔ اس صورت میں پھر ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو، پھر قدم اٹھاؤ۔"

دوسرے الفاظ میں ایاز مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اب تک تو ہم دونوں اس معاملے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شریک تھے، اب میں اپنے آپ پہ ہوں۔ میرے دل نے ہلکا سا ایک غوطہ کھایا۔ (جس کا اس مقدمے کے معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جس کا تعلق اس لمحاتی احساس سے تھا جو اس وقت ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے، جب کوئی شخص کسی بات کے اندر ہم سے کہتا ہے کہ ہم اب اپنے آپ پہ ہیں، چاہے وہ کوئی بھی شخص اور کیسی ہی بات کیوں نہ ہو۔) چند لمحوں تک میں ایاز کا منہ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر وہی کرنباک کیفیت تھی، جیسے وہ مجھے روک رہا ہو مگر ساتھ ہی ہمت بھی بڑھا رہا ہو، مجھ سے مدد مانگ رہا ہو۔ میں نے کئی بار خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ہم وہاں سے پلٹ آئے۔ ایاز کا چہرہ نکھرنے لگا تھا۔ اس شام کو آخر مجھے بے شک و شبہہ اس بات کا احساس ہوا کہ ایاز کے اندر اس مقدمے کی جڑیں کتنی گہری اتر چکی تھیں۔

حکیم پیر بخش شاہ ایک دبلا پتلا سفید ریش آدمی تھا جو انتہائی حلیم لہجے میں بات کرتا تھا۔ اندرونِ شہر ایک پرانی سی گلی میں اس کا مکان (اور مطب) تھا جہاں وہ حکیم جی کی بجائے شاہ جی کہلاتا تھا۔ دو دن تک میں اسی کش مکش میں مبتلا رہا کہ کس ڈھنگ سے اسے جا کر ملوں، کس طور پہ بات کروں۔ آخر ایک روز صبح سویرے میں اٹھا اور چل کھڑا ہوا۔ سب سے آسان طریقہ مجھے یہی لگا کہ پہلے ایک مریض کے طور پہ اپنے آپ کو پیش کروں۔ ایک بڑے سے کمرے میں حکیم دیوار کے ساتھ فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کا کمرہ ایک عام مطب کی مانند دکھائی دیتا تھا، مگر مردوں اور عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے زیادہ تر لوگ عمر رسیدہ تھے۔ میں غور سے حکیم کی کارروائی کو دیکھتا رہا، مگر مجھے پتا نہ چل سکا کہ کون کون اس کا مریض تھا اور کون مرید۔ کوئی دوا لے کر جا رہا تھا، کوئی خالی ہاتھ، مگر سب مریض نظر آ رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے ایک فرضی مرض کا بہانہ کر کے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ حکیم نے میری نبض ہاتھ میں لی اور سوالات شروع کر دیے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کسی دوسرے شہر کا نام بتا دیا۔ کس نے ہمارا پتا دیا ہے؟ اس سوال کے لیے میں تیار نہ تھا، چنانچہ ایک لحظہ رک کر میں نے ایک دوست کا نام دے دیا۔ حکیم نے ماتھے پہ ہلکی سی شکن ڈالی، جیسے اس نام کو یاد کر رہا ہو۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ پھر نبض ہاتھ سے چھوڑ کر پوچھنے لگا، کتنے دن کے بعد دوبارہ آسکتے ہو؟ میں نے بتایا کہ آج کل میں یہیں پہ ٹھہرا ہوا ہوں، کسی وقت بھی آسکتا ہوں۔ حکیم نے مجھے سات دن کی دوا دی، اور کہا کہ اگر آسکوں تو تین دن کے بعد آکر نبض دکھا جاؤں۔ دوا بے حد ارزاں تھی۔ گھر واپس آکر میں نے گولیوں کی چھوٹی سی بوتل اور چند پڑیاں ایک طرف کو رکھ دیں۔ مگر میں حکیم کی شخصیت سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ اس کا لہجہ دھیما تھا اور اس کی بات چیت میں ایک قدرتی وقار تھا۔ میں نے ذہن میں ایک مختلف قسم کے شخص کا تصور کر رکھا تھا۔ مگر میرے دیکھنے میں اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ لوگوں کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب تین دن پورے ہوئے اور میں واپس اس کے پاس پہنچا تو اس وقت تک بہت کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ حکیم کے ساتھ سیدھی بات کرنے میں ہی بہتری ہے۔ میں مطب کے ایک کونے میں لوگوں کے عقب میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ جب میرے آگے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ جاتے تو میں آگے بڑھنے کی بجائے کھسک کر دوسرے لوگوں کے عقب میں ہو جاتا۔ آخر میری کوششیں کامیاب ثابت ہوئیں اور دوپہر کے دو بجے کے قریب میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ حکیم نے مجھے بات کرنے کا موقع نہ دیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" وہ مسکرا کر بولا، "لکن میٹی کیوں کھیل رہے ہو؟"

میں کھسیا کر ہنس پڑا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی میرا راز افشا ہو چکا تھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے کہا۔

"میں پچاس سال سے نبض دیکھ رہا ہوں۔" حکیم بولا، "تمہیں کوئی مرض نہیں تھا۔ تمہارا منہ رکھنے کو میں نے دوا دے دی۔ مجھے پتا تھا کہ تم پھر آؤ گے۔" اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے بیٹا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی اور آہستہ آہستہ اپنا مطلب بیان کرنے لگا۔ جو کہانی میں نے بنائی وہ یہ تھی: میں ایک معمولی سا زمیں دار ہوں۔ چوہدری ظفر صاحب کچھ عرصے تک ہمارے شہر میں مجسٹریٹ رہے تھے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں میری ان سے راہ و رسم ہوئی تھی۔ چوہدری صاحب مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ میں ان کے گھر بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ میں اور میرا سارا خاندان چوہدری صاحب سے زیادہ بیگم صاحبہ کی نیک دلی اور خلوص کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے اخبار میں یہ واقعہ پڑھا تو مجھے از حد صدمہ پہنچا تھا۔ شاہ جی کے بیگم صاحبہ کے خاندان سے گہرے تعلقات کا مجھے علم تھا، چنانچہ میں ان کے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ ان کے ذریعے بیگم صاحبہ مرحومہ کی والدہ کے پاس حاضر ہو کر اظہارِ افسوس کر سکوں۔ اس کے علاوہ اگر اس معاملے میں میں کسی کام آ سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ ہر طرح کی گواہی دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔ بیگم صاحبہ کے ہمارے اوپر بڑے احسان تھے۔ پہلے دن بہت سے لوگوں کو دیکھ کر بات کرنے کی میری ہمت نہ ہوئی تھی، مگر آج اپنا مدعا بیان کر رہا ہوں۔ حکیم نے مجھ سے پوچھا کہ میں سیدھا قصور کیوں نہیں گیا۔ میں نے کہا کہ ایک تو بیگم صاحبہ کے خاندان والوں سے واقف نہیں تھا، دوسرے مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیگم صاحبہ کی والدہ کی صحت اچھی نہیں۔ چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ شاہ جی سے بات کروں اور ان کے واسطے سے قصور جاؤں۔ حکیم کچھ دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک دو بار اس نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ حکیم تجربہ کار آدمی تھا، مگر میرا بہروپ پہچان نہ سکا۔ وہ میرے پُرخلوص لہجے سے متاثر ہو چکا تھا۔ آخر بولا، "میں پیر کے دن قصور جا رہا ہوں، میرے ساتھ چلے چلنا۔" جب میں حکیم کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے لگا تو وہ بولا، "جو دوا رے گئے تھے اپنے ساتھ لیتے آنا۔ کسی اور کے کام آ جائے گی۔ یہ دوائیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔"

کوثر کی والدہ سے میری ملاقات کا واقعہ میری بیس سالہ ڈائری میں سب سے عجیب غریب واقعہ ہے۔ اس ملاقات کا حال میری ڈائری میں اس طرح درج ہے:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین فروری : سخت سردی تھی۔ بس پہ بیٹھ کر قصور پہنچے۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ سفر کے دوران حکیم سے چند معلومات حاصل ہوئیں۔ حکیم کو مرعوب کرنے کی خاطر میں اپنی ایک کتاب ساتھ لے گیا تھا۔ حکیم خاطر خواہ طور پر مرعوب ہوا۔ کوثر کا ماموں اس گھر کا کرتا دھرتا تھا۔ نواب شیر محمد خاں کہلاتا تھا۔ چند برس سے اس نے نوابی کی کروفر چھوڑ کر زمین داری کے ساتھ ساتھ خشک جنس کی آڑھت کا کاروبار شروع کر لیا ہوا تھا۔ جس کو وہ نہایت کامیابی سے چلا رہا تھا۔ ایکڑ سے زاید رقبے میں حویلی تھی۔ دوہری اینٹوں کی چھ فٹ اونچی دیوار رقبے کو گھیرے تھی۔ دیوار کائی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ قدیم حویلی ماضی میں کسی بڑے مہاجن کی رہائش گاہ لگتی تھی۔ رقبے کے کونے میں چھوٹے سے مندر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کھڑی تھی۔ بوسیدہ عمارت میں ایک غریب کنبہ رہتا تھا، جو شاید باہر کا کام کرتا تھا۔ مویشیوں کی دیکھ بھال اور صفائی وغیرہ کا کام۔ پیپل اور برگد کے بڑے بڑے درخت تھے۔ دو بھینسیں اور ایک بکری درختوں سے بندھی تھیں۔ گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔ قریب ہی ادھ ننگے بچے دھوپ میں کھیل رہے تھے۔ برآمدے میں ملازم نے ادب سے جھک کر حکیم کو سلام کیا۔ چند منٹ کے بعد آکر اسے اندر لے گیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں دھوپ میں بیٹھنا چاہتا ہوں یا اندر۔ میں نے کہا اندر۔ بڑا ہال کمرہ تھا۔ آرام دہ بھاری فرنیچر تھا۔ کمرے کے رنگ مدھم تھے، مگر قدیم ذوق اور فارغ البالی کا احساس ہوتا تھا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ چائے کی سینی آئی۔ ایک خوش شکل جوان لڑکا کمرے سے گزرا۔ اس نے جھک کر آداب کہا۔ میں براہ راست اس مقدمے میں ملوث نہیں تھا، مگر میرا دل اچھل رہا تھا۔ مشکل سے چائے کی آدھی پیالی حلق سے گزری۔ اندر سے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ظفر کے بچے تھے، میں نے سوچا۔ کام کرنے والے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ وقت گزر نہیں پا رہا تھا۔۔

یہاں پہنچ کر ڈائری کا رنگ بدل جاتا ہے۔ آدھے آدھے جملوں والا بے دم سا انداز ٹھہری ہوئی مربوط تحریر کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جیسے میرا دل اچھلنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بند ہو گیا ہو۔

میرا خیال تھا کہ جب مجھے اندر سے بلاوا آئے گا تو شاید پردے کے پیچھے بیٹھ کر بات چیت کرنی پڑے گی۔ صرف یہی ایک خیال تھا جو میرے دل کو حوصلہ دے رہا تھا۔ کچھ ایسا احساس تھا کہ میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا مگر اس کے باوجود پوشیدہ رہوں گا، گویا منزلِ مقصود تک پہنچنے میں جو خطرات لاحق ہوتے تھے ان سے میری ذات محفوظ رہے گی اور میں اس کارروائی میں شامل ہو کر بھی الگ تھلگ رہوں گا۔ مگر جب میں ملازم کے پیچھے چلتا ہوا حویلی کا اندرونی صحن پار کر کے برآمدے کے آخری دروازے میں داخل ہوا تو مجھے کمرے کی آراستگی یا ماحول کو دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ ایک بہت بڑے سفید بستر پہ ایک سفید بالوں والی عورت تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔ اس کے شکن آلود چہرے کی جلد کا رنگ بھی چمک دار سفید تھا، اور چھوٹے چھوٹے نازک مرجھائے ہوئے نقوش تھے۔ صرف اس کی آنکھیں بادامی رنگ کی بڑی بڑی اور جاندار تھیں۔ جس شئے نے یکایک میری حسیات پہ دھاوا بول دیا تھا وہ سفید رنگ کا ایک انبار تھا۔ سفید بستر، ان گنت چھوٹے چھوٹے سفید تکیے، سفید قمیض، دوپٹہ، سفید چہرہ، سفید بال، ننھے ننھے سفید ہاتھوں کی ہڈیاں، سفید میز پوش، سفید گلدان اور سفید پھول۔ میں نے جھک کر آداب کہا۔

"تشریف رکھیے۔" اس چہرے سے کھنکتی ہوئی مضبوط آواز برآمد ہوئی۔ میں پائنتی کی جانب رکھی ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ بستر پر ایک چار سالہ بچہ بیٹھا تھا۔ اس خاتون کا ایک ہاتھ بچے کی پشت پہ رکھا تھا اور وہ میری جانب دیکھنے کے بعد اب بچے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی، جیسے ہم دونوں سے کہہ رہی ہو، ایک دوسرے کو پہچانتے ہو؟ میرا ذہن ایک لحظے کے لیے یک دم خالی ہو گیا۔ کمرہ پھیلتے پھیلتے ایک بہت بڑا ہال بن گیا، اور کچھ دور بیٹھے ہوئے حکیم کے وجود کو میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک باریک نقطہ ہو۔ آخر وہاں پر میری آڑ لینے کی جس تمام تر میرے کام آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"انتصار کو میں یاد نہیں ہوں گا۔" میں نے کہا، "میں بچی کی ولادت پر ان سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت یہ ہمارے شہر سے تبدیل ہو کر جا چکے تھے۔"

کوثر کی ماں میری بات کا جواب دیے بغیر بچے کی پشت پہ ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک لمحے کو ہاتھ اٹھا کر بچے کے سر پہ رکھا اور ہاتھ کھینچ کر دوسرے کے برابر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"شاہ جی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ادیب ہیں۔" وہ بولی۔

"ان کی ذرہ نوازی ہے۔" میں انکسار سے بولا، "معمولی سا زمیں دار ہوں۔ کاشت کاری میں کئی دن فراغت کے آتے ہیں۔ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں۔"

"میرا بیٹا شاعر تھا۔" وہ بولی۔ اس کی آواز سے کسی قسم کا رنج ظاہر نہ تھا۔ اس نے یوں بات کی تھی جیسے کوئی اپنے آبا و اجداد کا فخر اور خوشی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

"کس نام سے لکھتے تھے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ منہ موڑ کر گلدان میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں کو دیکھنے لگی۔ پھر بہت دھیمی آواز میں گویا اپنے آپ سے بات کر رہی ہو، بولی، "کسی نام سے نہیں۔"

"جی؟"

"آپ نام تو جاننا نہیں چاہتے،" وہ ہلکے سے سرزنش کے لہجے میں بولی، "آپ دراصل یہ پوچھ رہے ہیں کہ ان کا کوئی دیوان چھپا۔ کہاں سے چھپا۔ کس نے چھاپا؟ یہی بات ہے نا؟"

"جی۔" میں شرمسار ہو کر بولا۔

"اس نے کبھی کوئی چیز نہیں چھپوائی۔" وہ پھر دھیمے لہجے میں بولی، "مگر وہ شاعر تھا۔"

"میں نے سنا ہے آج کل کسی غیر ملک میں رہتے ہیں۔" میں نے بات کی۔

"آپ سے کوثر نے بات کی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کو پتا ہے، کوثر ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی جب وہ چلا گیا تھا۔ مگر کوثر کو